فیض:۔ فیض احمد فیض کا ارتحال ۱۹۸۴ء میں ہوا۔ محترم ڈاکٹر مغیث الدین فریدی صاحب نے، جن کو فن تاریخ گوئی پر درجہ کمال حاصل ہے، اور اس فن پر شاید ہی کسی کے پاس اتنا لٹریچر موجود ہو جتنا فریدی صاحب کے پاس ہے، یہ قطعہ کہا جس کا عنوان بھی تاریخی ہے:۔ "سادہ طبع فیض احمد فیض" (۱۹۸۴ء)

دست اجل سے اور بھی کج ہو گئی تیری کلاہ تو نے غرور عشق کو بخشا کچھ ایسا بانکپن

خوشبو ترے اشعار کی "دستِ صبا[۱]" میں بس گئی
تاریخ بن کر رہ گیا "لطف غزل حسن سخن[۲]"

۱۹۸۴ء

ساغر نظامی: وفات ۱۹۸۴ء۔ قطعہ تاریخ از قمر سنبھلی، جو صنعت مرموز میں بہترین تاریخ ہے:۔

ہوا میخانہ غزل سونا ایک رند سخن کے سونے سے
چھن گئی ہے "مئے ادب" افسوس
آج "ساغر شکست" ہونے سے[۳]

۱۹۸۴ء

مالک رام اور ساحر ہوشیار پوری:۔ شہرۂ آفاق محقق جناب مالک رام صاحب کا انتقال ۱۹۹۳ء میں ہوا اور ساحر ہوشیار پوری ۱۹۹۴ء میں اس جہاں سے رخصت ہوئے۔ دونوں کی وفات کا قطعہ جناب کالیداس گپتا رضا نے لکھا اور بڑی خوبی سے دونوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ہنر مندی کے ساتھ سنین بر آمد کئے:۔

برس پہلے مالک ملے رام میں[۴] اٹھے آج ساحر بھی اس شہر سے[۵]

۱۹۹۳ء

بڑھا "صدمہ" اور یہ ہوا سال مرگ "فصاحت شعاری اٹھی دہر سے[۶]"

۱۳۹ ۱۹۹۴ء (۲؍ اگست)

(۱) مجموعہ کلام فیض کا نام (۲) گرامی نامہ بنام راقم مورخہ ۲۱ ستمبر ۱۹۹۶ء (۳) مکتوب قمر بنام راقم سطور مورخہ ۱۹ جنوری ۱۹۹۱ء (۴) برس پہلے یعنی (۱۹۹۴ء۔ ۱برس) = ۱۹۹۳ء (۱۶؍ اپریل) (۵) دہلی (فرید آباد) (۶) الطاف نامہ بنام فرمایہ مورخہ ۲۲؍ جنوری ۱۹۹۵ء

خواجہ احمد فاروقی:۔ خواجہ صاحب کے سانحہ ارتحال (۱۹۹۵ء) پر بزرگ محترم ڈاکٹر مغیث الدین فریدی صاحب نے اقبال کے ایک مصرعہ کو مادہ بناتے ہوئے درج ذیل تاریخی مرثیہ کہا جس کا عنوان ہے "رحلت عالی مقام خواجہ احمد فاروقی" (۱۹۹۵ء):۔

جو اردو کی ترقی کے لئے خود کو فنا کردے کہاں ہوتا ہے اس انداز کا آشفتہ سر پیدا
بدل دی تیرے "ذوق و جستجو" نے قسمت اردو اندھیرے میں کیا تو نے چراغ رہ گزر پیدا
شجر اردو کا بے برگ و ثمر ہونے ہی والا تھا تری محنت سے لیکن ہوگئے برگ و ثمر پیدا
تری ہمت پہ صادق آگیا اقبال کا مصرع "صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہمسفر پیدا[1]"
تری رحلت سے لوتھرا گئی ہے شمع اردو کی یہ ممکن ہی نہیں تجھ سا ہو اب صاحب نظر پیدا

ملی ہے "ایزدی تائید سے" تاریخ رحلت کی
"بڑی مشکل سے ہوتا ہے ~~چمن~~ میں دیدہ ور پیدا[2]"
۴۵۷

۴۵۷+۱۵۳۸=۱۹۹۵ء

ڈاکٹر رخ زماں انصاری: انتقال ۵/مارچ (ہولی) ۱۹۹۶ء تاریخی قطعہ رضا صاحب نے کہا:۔

اٹھ گیا بولتا چہکتا ہوا ڈاکٹر رخ زمان انصاری
چل دیا خود، اور اس کے گھر والے رہ گئے وقف نالہ وزاری
آہ ناہید[3] کا حبیب لبیب اب کرے کون اس کی دلداری
ڈوبتا جارہا ہے دل میرا بچیوں[4] پر ہے رقت اب طاری
چاہتا تھا لکھوں میں سال وفات کیسے لکھتا کہ اشک تھے جاری
اتنے میں غیب کے فرشتے نے دے دیا جیسے حکم سرکاری

لکھ دے "اندوہ، دکھ، الم کے ساتھ
"فرقت رخ زمان انصاری[5]"

۱۶۶+۱۸۳۰=۱۹۹۶ء

خدا اردو زبان کے ان شیدائیوں پر رحمت فرمائے۔ (جاری)

---

(۱) پہلا مصرع ہے: ربود آں ترک شیرازی دل تبریز و کابل را (اقبال، بانگ درا، طلوع اسلام) (۲) ہفت روزہ "ہماری زبان" نئی دہلی، یکم تا ۸/نومبر ۱۹۹۶ء ص ۲، مصرع اولی: ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے، اقبال بانگ درا، طلوع اسلام۔
(۳) بیگم انصاری (۴) دو بیٹیاں (۵) مکتوب گرامی مورخہ ۲۴/جنوری ۱۹۹۷ء۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور مسلم جانبازانِ حریت

قسط: ۳

ڈاکٹر مختار احمد مکی ریڈر و صدر شعبۂ سیاسیات کریم سٹی کالج جمشید پور، بہار

علی گڑھ کی فضا میں مکمل سکوت تھا۔ ۲۰ر مئی ۱۸۵۷ء کو بلند شہر سے ایک برہمن کو گرفتار کر کے دیسی سپاہیوں کے سامنے پھانسی دی گئی، الزام یہ تھا کہ اس نے سپاہیوں کو ورغلایا اور اکسایا ہے کہ باہر سے برات آئے گی، تمام لوگ شامل ہو کر انگریز افسران کو مار ڈالنا۔ انگریزوں کو علیگڑھ کی ۹ نمبر پیادہ رجمنٹ پر بہت بھروسہ تھا۔ لیکن اس برہمن کی موت کے ساتھ ہی ان فوجیوں میں اشتعال پیدا ہوا اور انگریز افسر علی گڑھ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ہندوستانی فوجیوں نے جیل خانہ توڑ کر قیدیوں کو چھڑا لیا اور دہلی کی جانب کوچ کر گئے، انگریزوں سے علی گڑھ خالی ہونے کے بعد زمام قیادت مولانا عبدالجلیل امام جامع مسجد علی گڑھ کے ہاتھ میں آئی۔ اگست ۱۸۵۷ء میں تازہ دم انگریز افواج آگرہ کی جانب سے علی گڑھ پر حملہ آور ہوئیں تو ۵ ہزار مجاہدین کے ساتھ مولانا عبدالجلیل مقابلہ پر ڈٹ گئے اس لڑائی میں مولانا سمیت ۷۲ مجاہدین شہید ہوئے، ان کو جامع مسجد علی گڑھ کے شمالی صحن گنج شہیدان میں دفن کیا گیا۔ موتی مسجد کے سامنے پھول چوراہہ اور عبدالکریم چوراہا پر پھانسی کا رسہ لٹکتا رہتا تھا اور جس پر بھی انگریز مخالف ہونے کا شبہ ہوتا اس کے خاندان کے تمام افراد کو پھانسی دے دی جاتی۔ تین سال تک برابر یہ سلسلہ جاری رہا۔

شاہجہاں پور میں میرٹھ کی بغاوت کی خبریں ۱۵ر مئی کو پہونچیں، ۲۸ویں رجمنٹ کو شہر کے انتظام کی ذمہ داری سونپی گئی، ۲۵ر مئی کو عین عید کے دن اسپیشل گارڈ اور سنتری ڈبل کرنے کا حکم دیا گیا۔ سپاہیوں نے اسے بے اعتقادی اور بے عزتی پر محمول کیا اور بددل ہو گئے ۳۱ مئی کو جب کچھ انگریز ایک گھر میں جمع تھے تو انقلابیوں نے تلوار سے ان پر حملہ کر دیا، چھاؤنی میں بھی بغاوت پھیل گئی، چند انگریزوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور بقیہ اپنی جان بچا کے

لئے دوسری جانب نکل گئے۔ نواب غلام قادر خان ناظم مقرر ہوئے ایک سال تک بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انہوں نے حکومت کا کام انجام دیا مورچہ کی کمان احمد اللہ شاہ کے تجربہ کار ہاتھوں میں تھی، انگریزی افواج کو بار بار ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور اکتوبر ۱۸۵۸ء کے بعد ہی وہاں پر انگریزوں کا قبضہ ہو سکا۔

۱۸۵۷ء کی تحریک جدوجہد آزادی خاصی بڑی تھی اور ہندوستانی عوام نے اس کے لئے جانی و مالی قربانیاں دی تھیں، اس کے باوجود یہ تحریک ناکام رہی اس ناکامی کی وجہ کمزور فوجی طاقت کا ہونا تھا۔ ان کے پاس جدید اسلحہ، سامان جنگ، اور تربیت کی کمی تھی، اور کچھ لوگ درپردہ انگریزوں سے ساز باز کر چکے تھے۔ مسلمانوں کا مذہبی طبقہ جو اس تحریک میں پیش پیش تھا ان کی تعداد ہندوستان کی کل آبادی کے تناسب میں کافی کم تھی۔ خاندان تیموریہ، لاپرواہ اکڑ مزاج ہو گیا تھا۔ بادشاہ مذہبی عقائد میں بہت ڈھیلا اوہام پرست، آرام طلب اور سادہ لوح تھا اور ایک وظیفہ خور رئیس کی صورت میں اپنی زندگی بسر کر رہا تھا، یہی وجہ ہے کہ اس کے دربار میں رجب علی، الہی بخش، اور حکیم احسان اللہ خاں جیسے غداران وطن پل رہے تھے، لیکن وہ کچھ کر پانے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ مغل شاہزادوں نے کبھی جنگ وجدل خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ مزید یہ کہ وہ آپسی رنجش اور محلاتی سازش کے شکار تھے، صاحب اقتدار نواب راجہ امراء و شرفاء اور مقامی زمینداروں کی ایک بڑی تعداد اس جدوجہد، آزادی کی حامی نہیں تھی اور اس تحریک کے دوران شرمناک کردار ادا کیا اور انگریزوں کی دولت، افواج اور جاسوسی سے مدد کی۔ ہندو گرچہ اس تحریک میں شامل تھے لیکن انہوں نے کافی دیر اور انتہائی بے دلی اور بے رغبتی کے ساتھ بہت کم تعداد میں شرکت کی۔ اور ان کی ایک بڑی تعداد غیر جانبدار رہی۔ سندھیہ، مرہٹہ، سکھ، اور گورکھے، انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ پنجاب کی سکھ ریاستیں پٹیالہ، نابھہ، راجپوتانہ، اور وسط ہند کی ریاستیں بیکانیر، جے پور، جودھ پور، اور بھوپال وغیرہ بھی تحریک کی مخالف تھیں اور نہ صرف انگریزوں کا ساتھ دے رہی تھیں بلکہ ان سے مل کر شرمناک سازشوں میں بھی مصروف تھیں اس طرح اکثر دیشی ریاستوں نے انقلابیوں کا ساتھ نہیں دیا، عام عوام کی اس تحریک سے [illegible] تھے کیونکہ ان کے درمیان انگریزوں کے خلاف متحدہ کوئی

پروپیگنڈہ نہیں ہوا تھا یہی وجہ ہے کہ پشاور میں تقریباً ۲۰۰ فوجیوں کو سخت ترین سزائیں دی گئیں لیکن عام عوام پر کوئی رد عمل نہیں ہوا۔ عوامی سطح پر یہ قومی تحریک بھی نہیں بن پائی کیونکہ واضح مقصد کا فقدان تھا۔ ذرائع نقل و حمل اور سلسلہ خبر رساں پر انگریزوں کا مکمل کنٹرول تھا۔ مزید یہ کہ اس تحریک سے تقریباً ۲۱ چھاؤنیاں متاثر تھیں اس کے باوجود یہ بکھری ہوئی تھیں۔ اور ان میں باہم شیرازہ بندی بھی نہیں تھی اور نہ ہی مرکز سے اتصال تھا۔ باغیوں کی رہنمائی کے لئے جو بھی مرکزی قیادت تھی وہ نظم وضبط اور تدبیر کی کمی کا شکار تھی، اس پوری جدوجہد میں ہوش کی بہ نسبت جوش کی کارفرمائی زیادہ تھی۔ انگریزوں کے خلاف متحدہ محاذ بھی کمزور پڑتا گیا۔ ہندوستانی افواج کے سربراہ اور محرک قائدین یکے بعد دیگرے جنگ میں کام آتے چلے گئے۔ جبکہ انگریزوں کی تازہ دم اور تربیت یافتہ فوجیں برابر پہونچ رہی تھیں، اس طرح جنگ آزادی کی تمام کوششیں تتر بتر ہو گئیں اور غتربود ہو کر رہ گئیں۔

مزاحمتی تحریک کے کمزور پڑنے پر انگریزوں نے ہندوستانیوں سے اس کا بھرپور انتقام لینا شروع کیا، حالانکہ مذہبی سیاسی اور اقتصادی استحصال کا ہی یہ نتیجہ تھا اور بقول لیکی اگر دنیا میں کوئی بغاوت حق بجانب کہی جاسکتی ہے تو وہ ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں کی یہ بغاوت تھی لیکن انگریز یہاں کے لوگوں کو بخوبی ذہن نشین کرادینا چاہتے تھے کہ اس نیم وحشی ملک میں وقار قائم رکھنے کا ایک ہی طریقہ غیر مشروط اور غیر مبہم وفاداری ہے تاکہ حاکم کا رعب ودبدبہ ہمیشہ باقی رہے اور انتقام کا تصور بھی فریق مخالف کو لرزہ براندام کردے۔ آکسفورڈ تاریخ ہند کے مطابق یہ بغاوت اپنے پیچھے بے شمار خوفناک حوادث، بے انتہا مصائب اور متعدد ایسے مکروہ اور رنجیدہ واقعات چھوڑ گئی ہے کہ ان کے ذکر سے بھی قلب کو صدمہ پہونچتا ہے۔[۲۴] بقول ایڈوارڈ ٹامسن غدر سے متعلق تقریباً تمام دستاویزات زبان حال سے ہماری زیادتیوں کا اعلان کرتی ہیں۔ ارنسٹ جونسن کا خیال ہے کہ "برطانیہ نے ہندوستان میں موت کا اس قدر لرزہ خیز ڈھنگ ایجاد کیا جس کے تصور سے ہی انسانیت کانپ اٹھتی ہے۔" برطانوی پارلیامنٹ کے ایک ممبر لے بارڈ نے ہندوستانیوں کے ذریعہ انگریزوں کے اوپر جس ظلم وستم کی رنگ آمیزی کے ساتھ تشہیر کی گئی تھی اس کی تردید کرتے ہوئے بیان دیا کہ پورے غور و تحقیق اور [illegible]

فراہم کرنے کے بعد مجھے مکمل یقین ہے کہ دہلی، کان پور اور جھانسی وغیرہ میں انگریزوں پر مظالم کی تمام داستانیں فرضی ہیں۔ جن کے گڑھنے والوں کو شرم آنی چاہئے۔"(۲۵)

دہلی میں قائم فوج اپنے چار ہزار سپاہیوں کی قربانی کے بعد ہی ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو داخل ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ظلم وزیادتی کا دور دورہ شروع ہوا ایسے تمام لوگ جو چلتے پھرتے نظر آئے سنگینوں سے وہیں ختم کر دیئے گئے کابلی دروازہ سے قلعہ تک اور جامع مسجد سے دہلی دروازہ تک جو تقریباً چار پانچ مربعہ میل میں پھیلے ہوئے امراء و شرفاء کے ہزاروں مکانات اور خوبصورت مسجدیں تھیں انہیں منہدم اور مسمار کر کے چٹیل میدان بنادیا گیا۔ جامع مسجد کی زبردست بے حرمتی کی گئی اور اسے انگریز اور سکھ فوجوں کے لئے بیرک بنادیا گیا۔ مینار کے پاس سور ذبح کئے جاتے اور پکائے جاتے اسے ڈھانے اور گرجا بنانے کا پروگرام تھا۔ لیکن جان لارنس کی تنہا کوشش کے نتیجہ میں یہ ناپاک عزائم پورے نہیں ہو سکے۔ لندن ٹائمز کے رپورٹر کے مطابق دہلی کے مردوں نے اپنی عورتوں کی عزت و آبرو کے خاطر انہیں قتل کر کے خودکشی کرلی۔(۲۶) بقول باس باغیوں کے جرم کے مقابلہ میں ہزارہا گنا زیادہ سنگین پاداش باشندگان دہلی کو برداشت کرنی پڑی۔ ہزارہا مرد وعورتوں اور بچوں کو بے گناہ نکالا گیا و برباد جنگلوں اور ویرانوں کی خاک چھاننی پڑی۔ استروانی کے مطابق نادر شاہی لوٹ مار اور قتل عام کو بھی ان واقعات نے بھلادیا جب نو گھنٹہ کے بعد محمد شاہ کی درخواست پر نادر شاہ نے اسے رکوادیا تھا اور یہ اسی وقت بند بھی ہو گیا تھا جب کہ فتح دہلی کے بعد انگریزوں نے قتل عام کی منادی کرادی اور سات دنوں تک دلی جلتی اور لٹتی رہی۔ تین ہزار لوگوں کو نام نہاد عدالت کے ذریعہ پھانسی دے دی گئی اور تقریباً ۲۷ ہزار مسلمانوں کو دہلی میں قتل کیا گیا۔(۲۷) لارڈ الفنسٹن نے اپنے ایک خط میں لارنس کو لکھا ہے کہ محاصرہ ختم ہونے کے بعد ہماری افواج نے جو ظلم کئے انہیں سن کر دل پھٹنے لگتا ہے۔ دوست دشمن کی تمیز کئے بغیر سب سے یکساں بدلہ لیا گیا۔(۲۸) برطانیہ کے ایک مشہور مقرر ایڈمنڈ برک نے ہسٹنگز کے ظلم وستم کی سخت ترین مذمت کرتے ہوئے چار دن تک پارلیامنٹ میں تقریر کی اور اسے سارق، ظالم، غارت گر، فریبی، جعل ساز، ٹھگ، بے ایمانوں کا سردار، دوزخ کا بھیڑیا جیسے القابات سے نوازا۔ اس کے باوجود اسے افسوس رہا کہ اس کے جرائم کی پوری

طرح تشریح کرنے والے اصطلاحات کی انگریزی زبان میں کی ہے۔[۲۹]

دہلی میں داخل ہونے والی انگریزوں کی فاتح افواج نے آس پاس کے دیہاتوں کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ مسلمانوں کی بڑی تعداد کو شہر سے نکال دیا گیا اور شہر میں داخلہ پر پابندی عائد کر دی گئی، شہر سے باہر جانے والوں کو گوجروں اور میواتیوں نے بری طرح لوٹا اور مارا، سینکڑوں بچے اور بوڑھے بھوک و پیاس سے مر گئے۔ ہزارہا عورتوں نے کنوؤں میں ڈوب کر اپنی عصمت کی حفاظت کی، بہادر شاہ کے نوجوان بیٹوں کو قتل کروادیا گیا۔ خاندان مغلیہ کے تمام مرد مروادیئے گئے تاکہ تخت کا کوئی دعویدار نہ ہو۔ بیٹے کا سر کاٹ کر بادشاہ کو پیش کیا گیا کہ یہ آپ کی نذر ہے جو بند ہو گئی تھی، اور جس کو جاری کرانے کی خاطر آپ بغاوت میں شریک ہوئے تھے۔[۳۰] بقول ہنری کوئن مسلم قیدیوں کی مشکیں باندھ کر برہنہ ان کو زمین پر لٹا دیا جاتا اور سر سے پاؤں تک تمام جسم کو گرم تانبے سے داغا جاتا۔ ان بدنصیب قیدیوں کے جلتے ہوئے گوشت کی مکروہ بدبو آس پاس کی فضا کو مسموم بناتی، سکھ اور یورپین نہایت وحشیانہ مسرت کے ساتھ اطمینان سے چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر اس تفریح سے لطف اندوز ہوتے، زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سی کر یا پھانسی سے پہلے ان کے جسم پر سور کی چربی مل کر پھانسی دی جاتی تھی یا انہیں زندہ جلایا جاتا تھا۔ اور ان کی چیخ پکار سے سکھ اور انگریز لطف اندوز ہوتے، بعض قیدیوں کو مجبور کیا جاتا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بدفعلیاں کریں، یا قیدیوں کو دائمی نجات کے لئے فی الفور نکلسن کا نعرہ (A La Lantaineo) یعنی پھانسی پر لے چلو، بلند کیا جاتا ان کے سروں سے بالوں کے گچھے کے گچھے نوچے جاتے ان کے جسموں کو سنگینوں سے چھیدا جاتا، ٹائمس اوف انڈیا نے اسے جنگلی یا وحشی انصاف کا نام دیا جبکہ اوٹرام (Outram) کے مطابق یہ معصوم انسانوں کا سنگدلانہ قتل عام تھا۔ اکثر فرنگی جوان محض تفریحاً اپنے ہی وفادار ملازموں اور وفادار ہندوستانی آدمیوں اور گھسیاروں کو گولی سے اڑا دیتے۔[۳۱] بقول سرسید کوئی آفت ایسی نہیں ہے جو اس زمانہ میں نہ ہوئی ہو اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی۔ گو وہ رام دین یا ماتا دین ہی نے کی ہو کوئی بلا آسمان پر سے نہیں چلی جس نے زمین پر پہونچنے سے پہلے مسلمانوں کا گھر نہ ڈھونڈا ہو۔[۳۲] ملکہ وکٹوریہ کی عام معافی یکم نومبر ۱۸۵۸ء یعنی ساڑھے تیرہ ماہ تک یہ صورت حال باقی رہی اور بقول بہادر شاہ ظفر۔

"جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابل دار ہے۔"

انگریزوں کے ذریعہ لکھنؤ پر قبضہ کرنے کے بعد قتل وغارت گری کا بازار گرم ہوا۔ چنانچہ ہر ہندوستانی خواہ وہ سپاہی ہو یا اودھ کا دیہاتی بیدریغ تہہ تیغ کیا جانے لگا۔ نہ تو ان سے کوئی سوال ہی کیا جاتا اور نہ ہی کوئی تکلف روا رکھا جاتا محض سیاہ رنگت ہی اس کے مجرم ہونے کی دلیل تھی، ہلاکت کے لئے ایک رسہ اور درخت کی شاخ ہی کافی تھی، کچھ لوگوں کو پھانسی دی جارہی ہوتی اور باقی قیدی وہیں کھڑے اپنی باری کے منتظر ہوتے۔ رڑکی سے متصل سنہرا گاؤں کے قریب برگد کا وہ درخت آج بھی موجود ہے جس کی شاخوں میں رسیوں کے پھندے ڈال کر ڈھائی سو باغیوں کو پھانسی دی گئی تھی۔ ۱۹۵۷ء میں جب بغاوت کی صد سالہ تقریبات منائی گئی تو شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے اسی برگد کے سایہ کو منتخب کیا گیا۔ میجر ریناڈ کو جنرل میل کی جانب سے یہ حکمنامہ موصول ہوا تھا کہ کانپور کے بعض دیہاتوں کو ان کی مجرمانہ حرکات کی بنیاد پر عام تباہی کے لئے منتخب کیا جائے اور وہاں کے تمام مردوں کو قتل کرنے کے بعد گھروں کو آگ لگادی جائے، باغی رجمنٹ کے تمام سپاہی فی الفور پھانسی پر لٹکادئے جائیں مراد آباد میں نواب محمد خان کو پہلے گولی کا نشانہ بنایا گیا اس کے بعد شہر میں ہاتھی کے پاؤں سے باندھ کر گھسیٹا گیا اور سکتے ہوئے چونے میں ان کی نعش ڈال دی گئی۔ (۳۳) قصبہ فتح پور کی تمام آبادی کو محاصرہ میں لیکر تہہ تیغ کیا گیا۔ جہاں جہاں باغیوں نے پڑاؤ کیا تھا ان ضلعوں کو تاخت وتاراج کیا گیا سڑک کی دونوں جانب دیہاتوں کو لوٹا اور جلایا گیا اور لوگوں کو بیدریغ قتل وغارت کیا گیا۔ یہاں تک کہ کچھ انگریز افسروں نے احتجاج کیا کہ اگر یوں ہی دیہاتوں کو لوٹا اور جلایا جاتا رہا تو فوج کو راستہ میں رسد اور چارہ بالکل دستیاب نہیں ہوسکے گا اور یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے تھا کہ بقول لارڈ رابرٹسن "ان بدمعاش مسلمانوں کو بتادیا جائے کہ خدا کے حکم سے صرف انگریز ہی ہندوستان پر حکومت کرینگے"۔ (۳۴)

امرتسر کے ڈپٹی کمشنر فریڈرک کوپر نے اپنی کتاب میں ایک دلخراش واقعہ کا تذکرہ کیا ہے جس کی بنیاد پر اسے پنجاب کے لفٹنٹ گورنر لارنس اور بعد میں منٹگو میری کی شاباشی حاصل ہوئی اور اسے ایک عمدہ کارنامہ قرار دیا گیا کوپر ہی کے لفظوں میں "حفاظتی تدابیر کے تحت

۱۳ر مئی کے دن تین ہزار آٹھ سو (۳۸۰۰) سپاہیوں سے لاہور میں ان کے ہتھیار لے لئے گئے اور تقریباً تین ماہ تک چار سو گورے اور سکھ سپاہی رات دن ان کی نقل و حرکت کی نگرانی کرتے رہے۔ ۳۰ر جولائی کو جب نہایت تیز آندھی چل رہی تھی اور وہ لوگ بھوکے پیاسے بھی تھے تو ان پر گھبراہٹ طاری ہوئی ایک مذہبی دیوانہ سپاہی پرکاش سنگھ نے ایک تلوار سے اپنے کمانڈر افسر میجر اسپنسر کو قتل کر دیا اور آندھی طوفان کے درمیان وہ لوگ وہاں سے بھاگ نکلے، جو لوگ باقی رہ گئے انہیں چھاؤنی کے اندر ہی سکھوں اور گوروں کی توپ نے خاموش کر دیا۔ پکڑے گئے لوگوں میں ۲۴ گھنٹہ کے اندر ہی ۵۰۰ فوجیوں کو پھانسی دے دی گئی مفرورین کے بقیہ لوگوں نے دوسرے دن دریائے راوی کو عبور کرنے کی کوشش کی لیکن دوسرے کنارے پولیس کی موجودگی کے باعث وہ ایسا نہیں کر سکے، ڈیڑھ سو لوگوں کو وہیں گولی سے بھون دیا گیا اور کثیر کو دوبارہ دریا عبور کرنے پر مجبور کیا گیا۔ بیشتر دریا میں ڈوب کر ہلاک ہوئے اور ان کا دریا کے اندر ہی شکار کیا گیا ایک بڑی تعداد دریا کے اوپر کی جانب بھاگ گئی اور وہاں سے ایک میل دور جا کر تیر کر ایک جزیرہ میں پہونچ گئی دور سے وہ لوگ جنگلی مرغیوں کی طرح سہمے سہمے نظر آرہے تھے۔ ان میں سے ۲۸۲ بھگوڑے فوجیوں نے بڑی آسانی سے گرفتاری دے دی، انہیں یقین دلایا گیا کہ ان کے خلاف مقدمہ چلایا جائے گا اور انہیں انصاف ملے گا ان لوگوں کو گرفتار کر کے کوتوالی لایا گیا اور ایک برج میں بند کر دیا گیا۔ ۳۰ر اگست کو بقرعید کا تہوار تھا اس وجہ سے تمام مسلمان فوجیوں کو چھٹی دیکر امرتسر روانہ کر دیا گیا۔ ایک عیسائی افسر اور وفادار سکھوں کی امداد سے ایک مختلف قسم کی قربانی کے لئے یہ قیدی رہ گئے۔ درختوں کی کمی کی وجہ سے پھانسی کی سزا موقوف کر دی گئی اور قیدیوں کو دس دس ٹولیوں میں ان کے بازوؤں کو پیچھے کی جانب باندھ کر میدان میں لایا جاتا اور انہیں گولیوں سے اڑا دیا جاتا۔ جب ڈیڑھ سو باغی اسی طرح قتل کر دئے گئے تو ایک بوڑھا سکھ سپاہی تکان سے غش کھا کر گر پڑا اس لئے آرام کے لئے تھوڑا سا وقفہ دیا گیا اور قتل کی کاروائی دوبارہ شروع کی گئی۔ جب ان کی تعداد ۲۳۷ تک پہونچ گئی تو ایک افسر نے اطلاع دی کہ باقی باغی برج سے باہر نکل رہے ہیں۔ مین برج کے دروازے کھولے گئے تو ہول ویل (Hole [illegible]) کا بلیک ہول (Black Hole) کی تلخ یادیں دوبارہ تازہ ہو گئیں۔ [illegible] (Wells [illegible]) کی